حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند.................... ہند

قرآن مجید کے اسرار وحقائق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ط

اما بعد!

فقد قال النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم: خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ (اوکما قال علیہ السلام)

ترجمہ: ''تم میں سے وہ شخص بہترین ہے جو قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتا یا دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے، خود پڑھتا ہے، دوسروں کو پڑھاتا ہے۔''

سراپا خیر وبرکت: اس امت کے لئے سب سے پہلی چیز جو لازم کی گئی اور جس کو سراپا خیر قرار دیا گیا وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید ہے، جس کے متعلق احادیث میں ''اَصْدَقُ الْحَدِیْثِ یا خَیْرُ الْحَدِیثِ فرمایا گیا۔'' اَصْدَقُ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ اَوْخَیْرُ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ ''یعنی سراپا سچ یا سراپا خیر۔ اللہ کی کتاب ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بابرکت ذات کے لئے خَیْرُ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا اطلاق فرمایا گیا، یعنی بہترین سیرت، سیرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ یہ دو بنیادیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ اول کتاب اللہ دوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

رسول اللہ تو اس امت کو وہ عنایت فرمائے جو خیر البشر ہیں، جو تمام بنی آدم اور تمام ملائکہ بلکہ پوری کائنات کے افضل ترین ہیں، اور کتاب اللہ قوانین خداوندی میں سب سے اعلیٰ ترین اور جامع واکمل ترین قانون ہے، اور اس کی تعلیم وتعلم کو بہترین مشغلہ قرار دیا گیا۔

فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم: اور یہ انہیں بنیادوں کی خیر وبرکت ہے جو امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جاری ہوئیں اور اسی سبب یہ امت خیر امت کے لقب سے سرفراز ہوئی۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تم ہی وہ بہترین امت ہو جس کو انسانیت کی بھلائی کے لئے وجود بخشا گیا۔ تو گویا بنیادیں بھی خیر مطلق اور بنیادوں کے ذریعے تربیت یافتہ امت بھی خَيْرَ اُمَّةٍ پھر یہ خیر مطلق چند طبقات پر حاوی ہوئی تو وہ طباقت بھی کامل و اکمل طریقہ پر باعث خیر بنے چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم زمانوں میں بہترین زمانہ میرا دور ہے، پھر اس سے ملا ہوا (یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا) پھر اس سے ملا ہوا۔ (یعنی تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کا)

ان زمانوں کے اعتبار سے اعلیٰ ترین فضیلت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نصیب ہوئی۔ اور قرآن کریم نے من حیث الطبقہ جس کو محترم ترین اور مقدس قرار دیا وہ یہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طبقہ ہے، جس میں کوئی تخصیص نہیں کی گئی مطلق اس طبقہ کو ہی خیر فرمایا گیا۔ اور قرآن کریم میں مختلف عنوانات سے اس طبقہ کی خیریت اور تقدس کو ظاہر و بیان فرمایا، ارشاد ہوا

والسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ...... جنہوں نے اسلام کی پہلی پکار پر لبیک کہا وہ مہاجروں ہوں یا انصاراً یا ان کی سچے دل سے پیروی کرنے والے، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اس میں جانبین کی باہمی رضا و خوشی بتائی گئی، تو یہ طبقہ مطلقاً خیر مطلق قرار پایا۔ یہ اللہ سے راضی، اللہ ان سے خوش، اور رضا خوشی کا یہ اعلان چونکہ قرآن کریم کے ذریعہ فرمایا گیا جو دوامی کتاب ہے اور جس کا وجود قیامت تک باقی رہے گا بلکہ آگے جنت میں بھی یہ جاری و ساری رہے گی، اور ایک لحاظ سے یہ ابدی کتاب ہے، لہٰذا اعلان رضا بھی ابدی ہے، اسکا اطلاق ہر دور اور ہر زمانہ میں ہوتا رہے گا۔ اور کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا کہ جس میں صحابۂ کرام ﷺ کی خیر میں کچھ فرق پڑے ورنہ ان سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا اعلان عام نہیں رہے گا۔ اعلان کی عمومیت ہی اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ صحابہ کرام ﷺ سے ابد تک راضی ہے اور رہے گا۔ اس کی رضا میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے راضی رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے گا۔

رضا اور نسبت کی حقیقت:

صوفیانہ کرام کی اصطلاح اسی تعلقِ رضا کو نسبت کہتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے تابع ہو جائے اور اللہ تعالیٰ بندہ کی جو مرضیات ہیں ان سے خوش ہو، جانبین کا یہی تعلقِ رضا ''نسبت'' کہلاتا ہے۔ جس بندہ کو یہ نسبت حاصل ہو جائے تو اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عافیت میں رکھے تب راضی، بیماری و دکھ میں رکھے تب خوش، جو بھی تقدیر خداوندی ہو بندہ اس پر مطلقاً رضا کا اعلان بھی کر دے اور دل سے بھی راضی ہو، جب بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر راضی ہو، تو پھر اللہ تعالیٰ بھی بندہ کی ہر منشا پر راضی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ بندہ کا جو منشا ہو وہ پورا فرماتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جس کو حدیث شریف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مشیت الٰہی: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کی شان بھی عجیب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی خواہش پورا کرنے میں اس قدر جلدی فرماتے ہیں کہ ادھر آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی ادھر اللہ تعالیٰ نے فوراً پورا فرمادیا۔

اسی کو یوں کہا جاسکتا ہے مشیت الٰہی بندہ کی مشیت کے تابع ہوگئی جو بندہ چاہتا ہے وہی ہوجاتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ یہی معاملہ تھا آپ ﷺ کی جو خواہش ہوتی پوری ہوجاتی، وجہ اس کی یہ تھی کہ جس طرح نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سراپا خیر تھے اسی طرح آپ کی خواہش بھی خیر مطلق ہوتی تھی، غیر خیر یا شر کی خواہش نبی کے ذہن کو چھو بھی نہیں سکتی۔ انبیاء کرام کے قلوب اتنے پاکیزہ، مقدس اور صاف ہوتے ہیں کہ ان میں جو ارادہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ خیر ہوتا ہے، جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے خیر مطلق ہوتی ہے، جب وہ خیر محض ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر ہی چلتی ہے خیر ہی کی پذیرائی ہوتی ہے، یہی وہ انتہائی مقام ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بندہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی اور اللہ بندہ کی ہر خواہش پر راضی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور مشیتِ الٰہی: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا عمر جدھر گھومتا ہے حق بھی ادھر گھومتا ہے۔ بظاہر تو صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جدھر مشیت خداوندی اور حق ہوتا ہے ہم ادھر ہی چلتے ہیں اور یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ جدھر عمر رضی اللہ عنہ گھومتا ہے حق بھی ادھر ہی گھومتا ہے۔ تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک مقام تو مبتدی کا ہوتا ہے کہ وہ تابع مطلق ہوتا ہے، جدھر حق ہوا اُدھر ہی گھوم جائے۔

اور ایک مقام منتہی کا ہوتا اس وقت یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ حق بندہ کی سمت گھومتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ مقام جانبین کی رضاء کامل سے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ بندہ سے راضی اور بندہ اللہ سے راضی اور یہ مقام پوری امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حاصل ہوا۔

عملِ خیر: اول پوری امت محمد کو دیگر امم کے مقابلہ میں خیر امت قرار دیا گیا، کنتم خیر امۃ پھر اس اُمت کی خیریت کو خیر القرون قرنی کے ذریعہ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مخصوص فرمادیا گیا، اس کے بعد عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں موجود مسلمانوں میں خیریت میں اس فرد کو ترجیح فرمائی گئی جو خود بھی قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دے، اس کی رغبت دلائے۔

خیر کم من تعلم القرآن و علمہ اس عمل کو خیر کہا گیا ہے!
قرآن کریم خود بھی خیر اس کو پڑھنے پڑھانے والے بھی خیر کے مستحق

حفاظت ربانی: ظاہر میں قرآن کریم دو چیزوں الفاظ و معانی کا مجموعہ ہے اور یہ دونوں منزل من اللہ ہیں، دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔ الفاظ قرآن جب نازل ہوتے تھے اسے جوں کا توں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام و حاضرین کو سنا دیتے، نہ کوئی لفظ کم کرتے نہ زیادہ۔

اس معاملہ میں جس طرح آپ امین تھے، اسی طرح معانی کے سلسلے میں بھی آپ امین تھے۔ الفاظ کی طرح ہی معانی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے القا کئے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت کا جو مقصد، مطلب و معنی آپ ﷺ کے قلب مبارک پر القا ہوتا آپ اسی کو روایت فرما دیتے اپنی طرف سے کوئی معنی بیان نہیں فرماتے۔

آپ ﷺ الفاظ میں بھی امین تھے اور معنی میں بھی امین! الفاظ میں بھی اللہ تعالیٰ کے اور معانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے، اور ان دونوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ ان میں قیامت تک کوئی خلل نہیں پڑ سکتا یہ الفاظ و معانی قیامت تک باقی رہیں گے، تحریف کرنے والے ہزار تحریف کریں، مگر حق ہی غالب رہے گا۔ الفاظ بھی باقی رہیں گے اور معانی بھی۔ اور خود قرآن کریم ہی نے اس کی گارنٹی دی ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (قرآن ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کو محفوظ رکھیں گے)

ابتداء نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت شریفہ تھی کہ جب وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ جلد جلد اس کو پڑھنے لگتے تاکہ الفاظ زبان پر چڑھ کر محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ط اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ آپ بھولنے کے خطرہ کے پیش نظر جلد زبان کو حرکت نہ دیجئے۔ اس کے الفاظ آپ ﷺ کے قلب میں جمانے اور زبان سے ادائیگی کا ہم ذمہ لیتے ہیں۔ گویا الفاظ قرآن کی حفاظت اور یادداشت کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی کہ آپ ﷺ کے قلب مبارک میں ان کو جمع بھی کر دیں گے اور آپ کی زبان مبارک سے پڑھوا بھی دیں گے۔ نہ جمع میں کوئی غلطی ہوگی اور نہ پڑھنے میں کوئی چوک ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ذمہ بھی تھا اور وعدہ بھی، عربی میں علیٰ الزام کے لئے آتا ہے جس چیز کو کوئی اپنے اوپر لازم کرتا ہے اور ذمہ لیتا ہے اس کی تعبیر علیٰ سے کی جاتی ہے، مثلاً کوئی کہتا علیّ الف درھم تو مطلب ہوتا ہے کہ مجھ پر لازم ہے کہ تم کو ایک ہزار روپیہ دوں یہ میری ذمہ داری ہے۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ الفاظ قرآن آپ ﷺ کے قلب میں جمع و محفوظ بھی کر دیں اور آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔

گویا قرأۃ بھی دوامی ہے جس میں کبھی اور کسی قسم کا خلل نہیں پڑ سکتا، اور جمع قرآن بھی دوامی ہے کہ اس میں بھی تحریف ورد و بدل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ قرآن الفاظ و معانی کا مجموعہ ہے، الفاظ پڑھے جاتے ہیں معانی پڑھے نہیں جاتے سمجھے جاتے ہیں تو یہاں قرآنہ فرما کر الفاظ پڑھانے اور زبان پر جاری کرانے کی ذمہ داری لی گئی، معانی سے متعلق یہاں کچھ نہیں فرمایا گیا، قرآن کے لفظی معنیٰ پڑھانے کے ہیں۔

معانی کی ذمہ داری ثم ان علینا بیانہ میں لی گئی ہے۔ یعنی الفاظ کے معنی کھول کھول کر بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے، پہلی آیت میں قرآنہ فرما کر الفاظ کی ادائیگی کی، قرأت کی ذمہ داری لی، اور اس آیت میں بیانہ فرما کر معانی بیان کرنے اور سمجھانے کی ذمہ داری لی۔

قرآن کی اوّلین حقیقی تفسیر

خلاصتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے دونوں اجزاء الفاظ و معانی کی ذمہ داری لے لی ہے، یعنی قرآن پڑھوانا بھی ہمارے ذمہ ہے اور

اس کے معنی ومفہوم کو جو قرآن کے موضوعات ہیں سمجھانا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

اور یہ بیان ہی دراصل حدیث کہلاتا ہے اور حدیث ہی کے ذریعہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآنی مقاصد کو واضح فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث بھی قرآن کی طرح قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ کیونکہ قرآن کے ساتھ بیان قرآن، باقی نہ رہے تو لوگ کچھ کا کچھ مطلب لیں گے، ایک معنیٰ کے ہزار معنیٰ بنیں گے (اور اس قرآن کے مُجو میں خلل واقع ہو جائے گا)

قرآن مجید کی اولین تفسیر حدیث نبویﷺ ہے، قرآن مجید میں اس کو بیان بھی کہا گیا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَااُنْزِلَ اِلَیْھِمْ...... ہم نے یہ ذکر (قرآن مجید) آپ پر اس لئے نازل کیا ہے کہ تاکہ آپ واضح اور کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کریں۔"

الفاظ جب آچکے تو اس کے معانی بیان ہوتے ہیں، اس لئے بیان معانی پر صادق آتا ہے، الفاظ بیان نہیں کہلاتے۔ وہ تلاوت کئے جاتے ہیں پڑھے جاتے ہیں۔

قرآن مجید کے جو الفاظ آچکے ان کے جو معانی اور مرادات ربانی ہیں ان کو بیان کر دینے کا نام تبیین ہے! یعنی واضح کر دینا تبیین للناس سے معلوم ہوا کہ حدیث بیان قرآنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک متن اتارا جس کا نام قرآن مجید ہے، اور اس متن کی ایک شرح اتاری جس کا نام حدیث ہے۔ اس کی تاکید لفاظ بیان سے کی اور اس سلسلے میں خود ذمہ داری لی ثُمَّ اِنَّا عَلَیْنَا بَیَانَہٗ کہ بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے کئی معنوں میں ڈھل سکتی تھی، مگر آپﷺ نے کبھی اس طرح نہیں فرمایا کہ اس آیت کے ایک معنیٰ یہ ہو سکتے ہیں، ایک یہ ہو سکتے ہیں اور زمانے کے مطابق فلاں معنیٰ ہیں، لہٰذا یہ معنیٰ مراد ہیں۔ بلکہ اس آیت کی مراد بھی اللہ تعالیٰ ہی آپﷺ کے قلب مبارک پر القا فرماتے، خود آپﷺ مراد پر غور نہیں فرماتے کہ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے، یہ مراد بھی ہو سکتی ہے۔ مراد کے دائرے میں رہ کر آپ عقل لڑائیں گے تو حکمتیں کھلیں گی، اور وہ حکمت قرآنی کہلائے گی۔ لیکن خود مراد کو عقل سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مراد اللہ تعالیٰ ہی بیان فرمائے گا کہ اس آیت سے میرا مطلب یہ تھا۔ اگر مراد آیت عقل سے ہی متعین کی جاتی تو قرآن کریم کئی اقسام کے ہو جاتے، جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ جب روزہ کے بارے میں آیت نازل ہوئی ابتدا میں یہ حکم تھا کہ رات کو سو کر جب بھی آنکھ کھلے اس وقت سے اگلے افطار تک بیچ میں کھانا پینا منع ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف فرمائی اور ارشاد فرمایا کُلُوْا وَاشْرَبُوْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ اِلَی الْفَجْرِ ط یعنی صبح کاذب کے بعد جب صبح صادق کا اجالا ظاہر ہو تو اب کھانے پینے سے رک جاء! اور روزہ کی نیت کرو۔

اس آیت کے نزول کے بعد لوگوں نے دو قسم کے دھاگے کالے اور سفید تیار کرائے اور سرہانے رکھ لئے جب سفید دھاگہ کالے دھاگے سے تمیز ہو جاتا تب کھانا پینا بند کرتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے بھی اسی طرح کے دھاگے تیار کرائے، اور تکیہ کے نیچے رکھ لئے، اور ان کو دیکھتے رہتے جب کالا دھاگہ، سفید

دھاگہ سے بالکل ممتاز نظر آتا تو روزہ کی نیت کرتے، حالانکہ اس وقت صبح صادق ہوئے خاص وقت 15-20 منٹ گزر چکے ہوتے۔ ان حضرات نے بااعتبار لغت یہ صورت اختیار کی تھی جو لغوی اعتبار سے غلط بھی نہ تھی مگر اللہ تعالیٰ کی چونکہ مراد نہ تھی اس سب کی دلجمعی نہ ہوئی اور معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت فرمایا کے اے علی تم کیا صورت کرتے ہو؟ آپؓ نے عرض کیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کلوا واشربوا کے نازل ہونے کے بعد دو ڈورے اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لئے ہیں اور انہیں دیکھتا رہتا ہوں جب تک کالا ڈورہ سفید سے ممتاز نہ ہو جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تمہارا تکیہ بڑا وسیع ہے کہ اس میں دن رات چھپ گئے کیونکہ کالے ڈورے سے رات مراد ہے اور سفید ڈورہ سے دن، دھاگوں سے ڈورے مراد نہیں۔

اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہاں لغوی معنیٰ مراد نہیں۔

قرآنی آیت اور لغت: یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لفظ کے ایک لغوی معنی ہوتے ہیں، اور ایک مرادی، قرآن مجید اترا تو لغت عرب پر ہے لیکن ہر جگہ لغت مراد نہیں۔ بعض جگہ قرآن مجید نے لغت تو زبان عرب سے لیا مگر معنیٰ اس کے اندر اپنے ڈالے اور وہی مرادی معنیٰ کہلاتے ہیں۔

اب دیکھئے صلوٰۃ کا لفظ ہے کہ لغت عرب میں اسکے معنیٰ دعا مانگنے کے ہیں، اب ایک آدمی دعا مانگ لیتا ہے تو لغت کے لحاظ سے صلوٰۃ ادا کر لی۔ یہاں باعتبار لغت بھیجنا اور دعا مانگنا تو صحیح ہے مگر اسے نماز پڑھ لینا، کہنا صحیح نہیں۔ کیونکہ صلوٰۃ کے لفظ کی یہ مراد نہیں ہے، اس سے مراد کچھ خاص اعمال وافعال ہیں کہ یوں نیت باندھو، اس طرح قیام ورکوع وسجود کرو، یوں قعدہ میں بیٹھو وغیرہ۔ اس مجموعہ کو صلوٰۃ کہتے ہیں، یہاں قرآن مجید نے لفظ ولغت عرب کا لیا مگر معنیٰ اپنے ڈالے، کہ یہاں صلوٰۃ سے ہماری مراد یہ ہے، اس مراد کی وضاحت کے بعد صرف دعا مانگنے کو نماز نہیں کہا جا سکتا، اور آدمی نماز کی ادائیگی سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح لغت عرب میں زکوٰۃ کے معنی پاک کر دینے کے ہیں، آپ ہاتھوں پر پانی ڈال کر دھو کر پاک کر لیں تو زکوٰۃ ادا ہوگئی، یہ ہزاروں روپیہ کی زکوٰۃ نکالنے کے معنی کہاں سے نکال لئے لغت میں تو اس کا کہیں پتہ نہیں۔ تو یہاں بھی قرآن حکیم نے زکوٰۃ کا لفظ تو لغت عرب سے لیا مگر اس کے معنی خود متعین کئے کہ اگر تمہارے پاس اتنا مال، روپیہ پیسہ ہو، اور اس پر ایک پورا سال بھی گزر جائے تو اس مال سے خاص مقدار کی رقم اللہ کی راہ میں نکالنا زکوٰۃ کہلاتا ہے۔ تو زکوٰۃ کے لغوی معنی جتنے بھی ہوں مراد عرفی معنی ہی ہیں جو قرآن کریم نے مراد لئے ہیں۔

اللہ جل شانہٗ نے بہت سے الفاظ لغت عرب سے لے کر ان میں اپنے معنی ڈالے اور وہی مرادی معنی ہوتے ہیں اور معلم ان ہی معنوں کو سمجھاتا ہے، بتاتا اور ان کی تعلیم دیتا ہے، اگر مرادی معنی ضروری نہ ہوتے، لغوی معنی ہی کافی ہوتے تو اتنا کافی ہوتا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام قرآن مجید کا ایک نسخہ لاتے، بیت

اللہ کی چھت پر رکھتے اور اعلان کر دیتے کہ اے لوگو! اور روحانی مریضو تمہارے لئے یہ نسخہ شفاء ہے، تم زبان داں ہو، عربی سمجھتے ہو، اس کتاب کو دیکھ دیکھ کر اپنا علاج کر لیا کرو۔ پھر پیغمبر مبعوث کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی، مگر مسئلے کہیں بھی لغت سے حل نہیں ہوا کرتے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی کہ وہ لغت سے اللہ تعالیٰ کی مراد متعین کر کے لوگوں کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا کیا مطلب ہے؟

مقاصد بعثت نبوی ﷺ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے چار وظیفے، کام، متعین ومقرر فرمائے۔

پہلا وظیفہ یتلوا عَلَيْهِمْ ايَاتِهِ یعنی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائیں اور امت تک ان کو پہنچائیں۔ آپ ﷺ نے یہ وظیفہ پوری امت کے ساتھ انجام دیا۔ اور پورا قرآن امت کو سنایا، ان تک پہنچایا۔ اس کے بعد دوسرا وظیفہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ کتاب کی تعلیم دو، تعلیم کا مطلب ہے کہ ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے جو مطلب اور مراد متعین کی ہے وہ اسے سمجھائیں۔ اور آپ ﷺ نے وہ معانی سمجھائے اور مرادات ربانی بیان فرمائیں۔ یہ تعلیم کا وظیفہ ہوا، جب نبی خود کوئی مراد متعین فرما دے تو اس کے اندر کوئی خلجان باقی نہیں رہتا، پھر تیسرا وظیفہ ''تعلیم حکمت'' بیان فرمایا۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حکمتیں بھی سکھائیں۔ حکمت کی دو قسمیں ہیں، (۱) حکمت نظری، (۲) حکمت عملی، بقاعدہ بلاغت حکمت نظری کی تعلیم کے اندر ہی آ گئی، اس کے بعد لفظ حکمت کے ساتھ حکمت کی تعلیم کا حکم دینے سے یہ متعین ہو گیا کہ اس سے حکمت عملی مراد ہے اور وہ ہے اسوۂ حسنہ آپ ﷺ کی مقدس سیرت آپ ﷺ نے مرادات ربانی نہ صرف سنائے...... نہ صرف ان کی تعلیم پر اکتفا فرمایا بلکہ عملی طور پر بھی ان کا نمونہ پیش فرما دیا۔ اب نہ کوئی خطرہ باقی ہے، نہ خدشہ اور نہ کوئی خامی باقی رہ جاتی ہے۔

اگر صرف لفظوں سے لوگوں کو عمل متعین کرنے کو کہا جاتا تو ہر ایک اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ متعین کر لیتا، مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ پر عمل بھی فرمایا اور ان مرادات ربانی کی ہیئت بھی دکھلا دی۔ اب اس میں کوئی خلجان باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز کے متعلق جو عمل کر کے دکھایا گیا اسی کے مطابق عمل کرو صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ جس طرح مجھے نماز پڑھتے تم نے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو۔ میرا اسوۂ عمل تمہارے لئے نمونہ ہے۔ تم اپنی مرضی کے مطابق اس کی ہیئت متعین نہ کرو میرا عمل اللہ تعالیٰ کی مراد کے مطابق ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی ہیئت مطلوب ہے۔ اس کے بعد کوئی خدشہ کوئی خلجان اس ہیئت کے متعلق کیسے باقی رہ سکتا ہے؟